R. N. 2186/57. Regd. No A. 922

انجمن ترقی اردو ہند کا ہفتہ وار اخبار

ہماری زبان

Telephone No. 29
Telegrams: "ANJUMAN"

قیمت
سالانہ تین روپے
ایک پرچہ
دس نئے پیسے
تاریخ اشاعت
۱، ۸، ۱۵، ۲۲

جلد ۲۰ - شمارہ ۳۲ | ایڈیٹر - آل احمد سرور | علی گڑھ - ۲۲ اگست ۱۹۶۱ء

ظفر احمد صدیقی

اقبال کا نظریۂ زماں

ہماری زبان کے یکم اپریل ۱۹۶۱ء کے شمارے میں جناب شبیر احمد غوری صاحب نے اقبال کے نظریۂ زماں پر اپنے کچھ شکوک اور اعتراضات کا اظہار فرمایا ہے۔ ہمارے خیال میں اقبال کے نظریۂ زماں پر غوری صاحب کا تبصرہ بعض غلط فہمیوں پر مبنی ہے۔ سطور ذیل میں ان غلط فہمیوں کو دور کرنے اور اقبال کا صحیح مسلک واضح کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

۱۔ غوری صاحب نے اقبال کے شاعرانہ خیالات اور سنجیدہ افکار میں امتیاز کرنے کی کوشش کی ہے اور تحریر فرمایا ہے۔

"جہاں تک ان کے شاعرانہ خیالات کا تعلق ہے تو وہ شعریت کا پہلو زیادہ لئے ہوئے ہیں، ان پر غور و فکر سے زیادہ جذبہ کا غلبہ ہے اور اس لئے ان کے متعلق یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ ان کے سنجیدہ خیالات ہیں۔"

یہ صحیح ہے کہ اقبال کا کلام شعریت سے بھرپور ہے۔ یہ بھی درست ہے کہ اس میں جذبہ کا عنصر نمایاں ہے۔ لیکن یہ تو ان کی عظمت کی دلیل ہے کہ وہ اپنے فلسفیانہ خیالات کو شعری حسن کے ساتھ جمع کرنے میں کامیاب ہوئے ہیں۔ رہا جذبہ کا سوال سو یہ ان کے فلسفیانہ عقائد کا ایک اہم جزو ہے کہ وہ اس فلسفہ کو "مردہ" یا "نزع کے عالم میں گرفتار" سمجھتے ہیں جو "خون جگر سے نہ لکھا جائے"۔ غرض انھوں نے شاعری کی زبان میں جو کچھ کہا ہے پوری فلسفیانہ ذمہ داری کے ساتھ کہا ہے۔ جو لوگ ان کی شاعری کو محض غزل سرائی سمجھتے ہیں ان کے متعلق وہ بارگاہ رسالت میں فریاد کرتے ہیں۔

من اے میر امم داد از تو خواہم ● مرا یاران غزل خوانے شمردند

ہاں یہ صحیح ہے کہ شاعری میں اکثر بات ٹکڑے ٹکڑے کر کے کہی جاتی ہے۔ کبھی صرف اہم نتائج بیان کر دیے جاتے ہیں اور بیچ کی کڑیاں حذف کر دی جاتی ہیں۔ اس لئے جب تک تمام منتشر اور محذوف کڑیوں کو جمع کر کے ایک مربوط نظر نہ ڈالی جائے ان خیالات پر ہم آہنگی کے فقدان اور تضاد کا گمان گذرتا ہے۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ غوری صاحب نے زمانہ کے متعلق اقبال کے منظوم افادات کو "تضاد" اور "باہم دگر دست و گریباں" ہونے کے عیب سے ملوث پایا۔

غوری صاحب کا اقبال کے خلاف سب سے اہم اعتراض یہ ہے کہ "اگر ان پر توحید او وحدت کا جذبہ غالب ہو جاتا ہے تو وہ [illegible] متکلمین کی ہمنوائی میں زمان و مکان ہی کے منکر ہو جاتے ہیں اور مابعد الطبیعی فلسفہ کی تمام فکری سرگرمیوں کو جو انھوں نے حقیقت زمانہ کی توضیح کے سلسلے میں انجام دی ہیں شرک اور زنار پوشی سے تعبیر کرتے ہیں۔

خرد ہوئی ہے زمان و مکاں کی زناری
نہ ہے زماں نہ مکاں لا الٰہ الا اللہ

اور جب کائنات کی وسعتوں کے مقابلے میں انسان اور اس کی مساعی ہیچ در ہیچ نظر آتی ہیں تو پھر یہی "موہوم زمانہ" ان کے خیال میں مؤثر حقیقی بن جاتا ہے اور اس وقت اقبال .... عرب جاہلیت کی "دہر پرستی" تک پہنچ جاتے ہیں۔

آئیے ذرا اس تضاد کی حقیقت پر نظر ڈالیں۔ یہ بظاہر متضاد دعوے در اصل دو مختلف سطحوں یا دو مختلف درجوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ جب اصل ماخذ اور مابعد الطبیعیاتی حقیقت کی طرف اشارہ مقصود ہوتا ہے تو اقبال یہ کہتے ہیں۔

خدا اصل مکان و لامکاں ہے
مکاں کیا ہے اک انداز بیاں ہے

یا

خرد ہوئی ہے زمان و مکاں کی زُنّاری
نہ ہے زماں نہ مکاں لا الٰہ الا اللہ

جب ظاہری تعینات اور سائنسی نقطۂ نظر کی بات ہوتی ہے تو وہ ان خیالات کا اظہار کرتے ہیں:

سلسلۂ روز و شب نقش گر حادثات
سلسلۂ روز و شب اصل حیات و ممات
سلسلۂ روز و شب تار حریر دو رنگ
جس سے بناتی ہے ذات اپنی قبائے صفات

ان اشعار میں زمان کی ایک بدیہی اور ظاہری خصوصیت کی طرف اشارہ ہے۔ وہ یہ کہ اس عالم آب و گل کا کوئی واقعہ یا حادثہ وقت کی خصوصیت سے متصف ہوئے بغیر اور وقت کے تعینات میں داخل ہوئے بغیر صورت پذیر نہیں ہوتا۔ یہی وقت گذراں کے ہر نقش کے فانی ہونے کی دلیل ہے۔

اوّل و آخر فنا باطن و ظاہر فنا
نقش کہن ہو کہ نو منزل آخر فنا

لیکن ان اشعار میں بھی سلسلۂ روز و شب کو "نقش گر حادثات" کہا گیا ہے۔ خالق حقیقی نہیں۔ خالق حقیقی وہ "ذات" ہے جو روز و شب کے تانے بانے سے اپنی "قبائے صفات" تیار کرتی ہے۔ اسی نظم میں آگے چل کر یہ پہلو اور بھی واضح ہو جاتا ہے۔ جب وہ یہ بتاتے ہیں کہ عشق کی حقیقت اس وقت گذراں میں محدود نہیں۔ انسان (ا) عشق کے ذریعے (یعنی ذات حقیقی سے اپنے گہرے تعلق کا ادراک کرکے، اور اس کے تقاضوں پر چل کر) زمانے کی دست برد سے آزاد اور لافانی ہو جاتا ہے۔

عشق کی تقویم میں عصر رواں کے سوا
اور زمانے بھی ہیں جن کا نہیں کوئی نام
مرد خدا کا عمل عشق سے صاحب فروغ
عشق ہے اصل حیات موت ہے اس پر حرام

جاوید نامہ میں زروان یا روح زماں کی زبان سے جو اشعار اقبال نے کہلوائے ہیں اور جن کو غوری صاحب نے اپنے دعوے کی تائید میں پیش فرمایا ہے۔ ان میں صرف ظاہری پہلو سے زمانہ کی مذکورہ بالا خصوصیت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ اس کا بین ثبوت یہ ہے کہ زروان اپنی رجز نما خود ستائی کے بعد اس حقیقت کا اعتراف کرتا ہے کہ جو "لی مع اللہ" کی نسبت سے سرفراز ہوتا ہے وہ میرے طلسم کو توڑ دیتا ہے یعنی جب مرد مومن کی نظر مظاہر سے آگے ذات خداوندی کی کارفرمائی دیکھتی ہے اور خود اپنے اندر اس کی معیت کو مشاہدہ کرتی ہے اس کے لئے زمانہ محض ایک مجاز کی حیثیت رکھتا ہے جس کی حقیقت اور اصل خدا ہے۔

اس تشریح سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اقبال کا نظریۂ زماں ان کے نظریۂ تصوف ہی کی ایک کڑی ہے۔ اس حقیقت کے پیش نظر غوری صاحب کا یہ تجزیہ کہ جو مستشرقین سے جو زروانی خیالات اقبال نے سنے تھے وہ ان کے لاشعور میں جمع ہوتے رہے اور قرآنی مطالعے کے دوران میں حقیقت زماں کی تشریح کے سلسلے میں وہ خیالات لاشعور سے شعور میں آ گئے نہ صرف غیر ضروری بلکہ دور از کار اور ناقابل تسلیم معلوم ہوتا ہے۔ اقبال بار بار اور پرزور طریقے سے اس بات کا اعلان کرتے ہیں کہ حقیقت زماں کے متعلق ان کے خیالات غیر اسلامی (یورپین یا ایرانی) ماخذوں سے مستعار نہیں، بلکہ قرآنی مطالعے اور بعض اکابر اسلام کے اقوال پر غور و خوض کرنے کا نتیجہ ہیں۔ اسرار خودی میں وہ امام شافعی کا قول "الوقت سیف" ہمدردانہ تائید کے ساتھ نقل کرتے ہیں۔ قریبی عہد کے مشہور فلسفی برگساں سے ملاقات کے موقع پر کہا جاتا ہے، اقبال نے اس کو یہ حدیث سنائی۔ "لا تسبوا الدھر، فان اللہ ھو الدھر" تو برگساں نے اس پر تحسین آمیز حیرت کا اظہار کیا۔ اس روایت سے یہ غلط فہمی نہ ہونی چاہیے کہ جاہلیت عرب کے عقیدہ کے مطابق دہر یا زمانہ خدا ہے یا اقبال ایسا سمجھتے تھے بلکہ مقصود یہ ہے کہ دہر یا زمانہ کے پس پردہ اصل کارفرما ذات خداوندی ہے۔ دہری جن افعال اور اثرات کو دہر سے منسوب کرتا ہے ان کو در اصل ذات خداوندی سے منسوب ہونا چاہیے۔

آخر میں ہم غوری صاحب کے اس سوال کا جواب دینے کی کوشش کریں گے کہ اقبال کے یہ خیالات کہاں تک اسلامی الاصل ہیں۔ در اصل اقبال کا سارا کلام اسلام کو سمجھنے اور جدید ذہنوں کے سامنے پیش کرنے کی ایک فلسفیانہ کوشش ہے اس کوشش میں انھوں نے جگہ جگہ جدید فلسفہ اور سائنس کے نتائج فکر سے فائدہ اٹھایا ہے اور ان کے قابل قبول اجزا کو اسلام کی تعبیر و تفسیر میں استعمال کیا ہے۔ لیکن اس قسم کی تعبیر و تفسیر کے لئے یہ ضروری نہیں کہ اس کے تمام اجزا بجنسہ قرآن یا حدیث میں مل جائیں۔ نہ شک شبہ سے بالاتر ہونے میں ان کو قرآن اور حدیث کا درجہ دیا جا سکتا ہے۔ ان کی اپیل اور افادیت خاص طور سے ایسے لوگوں کے لئے ہے جو عقل اور فلسفہ کی روشنی میں اسلامی حقائق کو سمجھنا چاہتے ہیں۔ اقبال نے درحقیقت ایک نقطۂ نظر پیش کیا ہے جس کی مدد سے مذہب اور فلسفہ کی بعض پیچیدہ گتھیاں (مثلاً مسئلہ تقدیر اور مسئلہ خیر و شر وغیرہ) سلجھائی جا سکتی ہیں لیکن اس نقطۂ نظر کی حیثیت بڑی حد تک ذوقی اور وجدانی ہے۔

ضروری اعلان: براہ مہربانی خط و کتابت کرتے وقت خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیجئے ——— منیجر

اداریہ

مولوی عبدالحق کی یاد میں

کراچی کے ایک تار سے معلوم ہوا کہ ۱۶ اگست کو مولوی عبدالحق کا انتقال ہوگیا۔ جولائی میں مولوی صاحب کی شدید علالت کا علم ہوا تھا، مگر خیال یہ تھا کہ وہ اپنی غیر معمولی صحت کی وجہ سے یہ خطرہ بھی جھیل جائیں گے، مگر فطرت کو کچھ اور منظور تھا۔ افسوس ہے کہ اردو کا یہ بہت بڑا عاشق، محقق، ادیب، اور مجاہد، جسے بجا طور پر بابائے اردو کہا جاتا تھا، اکیانوے برس کی عمر میں اس دنیا سے رخصت ہوگیا۔

مولوی صاحب ہاپڑ کے رہنے والے تھے۔ علی گڑھ ایم اے او کالج سے بی اے کرنے کے بعد حیدرآباد میں محکمۂ تعلیم میں ملازم ہوگئے۔ شروع سے وہ نہایت ذہین، سنجیدہ اور متین سمجھے جاتے تھے۔ سرسید کی اُنھوں نے آنکھیں دیکھی تھیں اور مولانا حالی کے تو وہ شاگرد رشید سمجھے جاتے تھے۔ شبلی سے بھی انھوں نے فیض اُٹھایا تھا۔ وہ ملازمت کے زمانے میں منصبی کاموں سے ہی دلچسپی نہ رکھتے تھے بلکہ ادبی اور علمی کاموں میں بھی مصروف رہتے تھے۔ ۱۹۱۲ء میں مسلم ایجوکیشنل کا وہ شعبہ جو ترقی اردو کے نام سے موسوم تھا، مولوی عبدالحق کے سپرد ہوا۔ اس وقت اس شعبے کا سرمایہ کچھ فائل اور ایک بکس تھا۔ مولوی صاحب نے اس کام پر ایسی توجہ کی کہ یہ شعبہ انجمن ترقی اردو ہند کی حیثیت سے اردو کا سب سے بڑا ادارہ اور ہندوستان کے اداروں میں ایک ممتاز انجمن بن گیا۔ ۱۹۱۲ء میں جب ہمدرد جاری ہونے والا تھا تو مولانا محمد علی، مولوی عبدالحق کو بھی اس کی ادارت کے لئے بلانا چاہتے تھے۔ مگر عبدالحق مولانا محمد علی کی سیمابی طبیعت سے واقف تھے اس لئے وہ نہ گئے۔ انھوں نے انجمن کے لئے خود کتابیں لکھیں، دوسروں سے لکھوائیں، اس کے لئے چندہ کیا، ملک کے ممتاز اشخاص کی ہمدردی حاصل کی اور اسے ایک طاقت اور تحریک بنا دیا۔ انھوں نے اُردو کے قدیم تذکرے صحت کے ساتھ مرتب کرکے شائع کئے اور ان پر فاضلانہ مقدمے لکھے۔ اُنھوں نے محمد قلی قطب شاہ، وجہی، نصرتی کی اہمیت کی طرف توجہ دلائی، صوفیائے کرام نے اُردو کی ابتدائی نشوونما میں جو کام کیا ہے اس کی قدر و قیمت واضح کی۔ عالمی ادب کے شاہکاروں کو اُردو میں منتقل کیا۔ ۱۹۲۲ء سے رسالہ اُردو نکالنا شروع کیا جو ۱۹۴۷ء تک برابر نکلتا رہا اور اس کے بعد پھر پاکستان سے نکلا۔ اس کے صفحات میں تحقیق و تنقید، تبصرے اور ترجمانی کے ایسے ایسے نمونے پیش کئے گئے کہ ان پر ہر زبان فخر کرسکتی ہے۔ مولوی صاحب نے اورنگ آباد میں رابعہ درانی کے مقبرے کو اپنا مستقر بنایا اور اس پُرفضا مقام پر اُردو کے اچھے لکھنے والے جمع کر لئے۔ جب وہ محکمۂ تعلیمات کی ملازمت سے سبکدوش ہوگئے تو جامعہ عثمانیہ میں اُردو کے پروفیسر مقرر ہوئے اور ۱۹۳۶ء تک اردو کی خدمت کے علاوہ یونیورسٹی میں بھی کام کرتے رہے۔ جامعہ عثمانیہ میں اُردو کو ذریعہ تعلیم بنانے میں سب سے بڑا ہاتھ اُنھیں کا تھا۔ دارالترجمے کے قیام کے بھی وہی محرک تھے۔ انھوں نے ہندوستان کے مختلف گوشوں میں انجمن ترقی اُردو کی شاخیں قائم کیں اور اُردو کے ادیبوں اور کارکنوں کو اُردو کے تحفظ اور بقا کے لئے کوشش کرنے کی طرف مائل کیا۔ جب اور جہاں اُردو کے لئے کوئی خطرہ نظر آیا وہ سینہ سپر ہوگئے۔ اس معاملے میں انھوں نے کبھی کبھار غلو سے بھی کام لیا۔ اُنھوں نے اُردو کی تحریک کو اس زمانے کی سیاست سے ملا دیا جس کی وجہ سے ہندوستان میں اُردو کی پوزیشن کو بجائے فائدہ پہنچنے کے نقصان پہنچا۔ یہی وجہ ہے کہ جب ملک کی تقسیم ہوئی تو ہندوستان میں اُردو کے خلاف خاصے بڑے پیمانے پر تنگ نظری کا مظاہرہ ہوا۔ ان کے اس نقطۂ نظر سے ہمیں اتفاق نہ تھا مگر ان کی نیک نیتی۔ خلوص۔ جوش اور جذبے کی ہم نے ہمیشہ قدر کی۔ وہ پاکستان جانے کے بعد بھی خاموش نہ بیٹھے، بلکہ اپنے نقطۂ نظر کے مطابق اُردو کی خدمت کرتے رہے۔ وہاں کی یونیورسٹیوں میں اُردو کے آزاد شعبے قائم کرنے میں، وہاں اُردو کو اس کا مقام دلانے میں، اُردو کے علمی سرمائے میں اضافہ کرنے میں، وہ برابر مصروف رہے۔ وہ نوجوانوں کی بڑی ہمت افزائی کرتے تھے۔ پرانے ہونے کے باوجود وہ نئی چیزوں سے بھڑکتے نہ تھے، بلکہ ان کی حمایت کرتے تھے۔ وہ خود سادہ نثر لکھتے تھے جو بڑی جاندار ہوتی تھی — وہ بڑے زندہ دل آدمی تھے اور بڑی پرلطف گفتگو کرتے تھے۔ آخر تک وہ برابر تصنیف و تالیف میں مصروف رہے۔ وہ بڑے باقاعدہ آدمی تھے اور اُن کے کھانے پینے، سونے کے اوقات مقرر تھے۔ وہ مغربی ادب کے شاہکاروں سے اچھی طرح واقف تھے۔ عالمی میلانات پر اُن کی نظر تھی، وہ اردو کو ایک آزاد اور خودمختار زبان سمجھتے تھے۔ ان کی قواعد اُردو پہلی قواعد ہے جو اُردو کو عربی فارسی کا ضمیمہ قرار نہیں دیتی۔ انھوں نے نہ صرف آکسفورڈ ڈکشنری کا ترجمہ کیا تھا بلکہ برسوں کی محنت کے بعد چند رفیقوں کی مدد سے اُردو کی ایک بڑی لغت بھی تیار کی تھی جس کی اشاعت کی تیاری کر رہے تھے۔

اُردو میں بہت بڑے بڑے ادیب اور انشا پرداز پیدا ہوئے ہیں مگر عبدالحق کا ثانی ملنا مشکل ہے۔ عبدالحق اُردو کے بڑے محسن ہیں۔ کاش اُردو میں اور عبدالحق پیدا ہوسکیں جو اُردو کی ترقی کے لئے اپنی ساری زندگی وقف کرسکیں۔ جہاں جہاں اردو بولنے والے اور اُردو سے دلچسپی رکھنے والے موجود ہیں، اس مجاہد اعظم کی موت کا ماتم کیا جائے گا۔ ان کی زندگی ایک نمونہ اور مثال رہے گی۔

اور اس کے کارنامے روشنی اور گرمی کا سرمایہ۔ اسکے بعض خیالات سے اختلاف تو ہوگا اور اختلاف کی گنجائش کہاں نہیں ہوتی۔ مگر اس کی عظمت اور اس کی گراں قدر خدمات کے وزن و وقار سے کون انکار کر سکتا ہے۔ جب تک اُردو زندہ ہے، یہ زندہ و تابندہ رہیں گی۔

بابائے اُردو کے انتقال پر

انجمن ترقی اُردو (ہند) علی گڑھ کا تعزیتی جلسہ

بابائے اُردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق کے انتقال کی اچانک خبر سے انجمن ترقی اُردو ہند کے کارکنوں میں ایک اُداسی اور سوگواری کی فضا پیدا ہو گئی۔ حال ہی میں جنرل سکریٹری صاحب انجمن ترقی اُردو ہند نے مولوی صاحب کی مزاج پُرسی ایک تار اور خط سے کی تھی، جواب میں اسی معذرت کے ساتھ کہ وہ خود خط نہیں لکھ سکتے اپنی خیریت لکھوائی تھی کہ اب وہ روبصحت ہیں۔ (آپ کے خط سے) مولوی صاحب قبلہ بہت محظوظ ہوئے خصوصاً اس جملے پر کہ "آپ کے ساتھ علالت کا تصور کسی طرح موزوں نہیں" بڑا زوردار قہقہہ لگایا۔ افسوس یہ قہقہے ہمیشہ کے لئے خاموش ہو گئے۔

انجمن کے دفتر میں پروفیسر آل احمد سرور جنرل سکریٹری کی صدارت میں ایک جلسہ مورخہ ۱۰ راگست ۶۱ء منعقد ہوا، جس میں حسب ذیل تجویز تعزیت ایستادہ ہو کر منظور کی گئی اور دفتر میں چھٹی کر دی گئی:-

"انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ کے کارکنوں کا یہ جلسہ اُردو کے عظیم ادیب، محقق اور محسن بابائے اُردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق کے انتقال پر ملال پر اپنے دلی رنج و غم کا اظہار کرتا ہے۔ انجمن ترقی اُردو کے قیام و تشکیل اور اس کی نشوونما اور اردو زبان و ادب کی ترقی اور فروغ کے لئے انھوں نے ساری عمر جس خلوص سے جدوجہد کی اس کی مثال مشکل سے ملے گی۔ سنہ ۱۹۴۷ء تک وہ انجمن ترقی اُردو ہند کے سکریٹری رہے اور انھوں نے انجمن کو ہندوستان کے ادبی اداروں میں نمایاں کر دیا اور اسے قومی حیثیت دے دی۔ یہ جلسہ مرحوم کی وفات کو اردو زبان و ادب کے لئے ایک ناقابل تلافی نقصان عظیم تصور کرتا ہے اور دست بدعا ہے کہ خداوند کریم انھیں جوار رحمت میں جگہ عطا فرمائے۔ آمین۔" (انجمن ترقی اردو ہند) علی گڑھ۔

ضروری گذارش

"ہماری زبان" میں اشاعت کے لئے مضامین نظم و نثر بھیجتے وقت اسکا خیال رکھئے کہ وہ غیر مطبوعہ اور مختصر ہوں ——— ادارہ

اِدھر اُدھر سے

پانچ عالموں کو یوم آزادی کے اعزازات

صدر جمہوریہ ہند نے پانچ عالموں کو اعزاز کے سرٹیفکٹ عطا کئے ہیں ان میں سے چار سنسکرت کے اور ایک فارسی کے عالم ہیں۔ ان کے نام درج ذیل ہیں:-

شری ہری داس سدھانت واگیش، شری کوولگوڈے، بی گوپالن نائر، شری رت داس پرتا، پنڈت سکھو لال جی سنگھوی اور ڈاکٹر عبدالستار صدیقی۔

ڈاکٹر عبدالستار صدیقی عربی میں بی ایم اے ہیں۔ پی ایچ ڈی کی ڈگری انھوں نے جرمنی سے حاصل کی تھی۔ موصوف کی عمر ۷۶ سال کی ہے۔ انھوں نے جرمنی میں پروفیسر لٹمین کے ساتھ مل کر "ہاروت اور ماروت" پر تحقیق کا کام کیا ہے۔

انھوں نے عربی اور فارسی زبانوں، ادب، تالیف لغت اور زبانوں کے تقابلی مطالعے وغیرہ پر متعدد تحقیقی مقالے بھی شائع کئے ہیں۔ انھیں یوپی میں گورنمنٹ آف انڈیا کے اسکالر کی حیثیت سے منتخب کیا گیا تھا۔

موصوف کی تصانیف میں جرمنی زبان میں فارسی پر ایک کتاب ہندوستانی مصوری سے متعلق ایک کتاب اور "معربات راشدی" شامل ہیں۔

سنسکرت عربی اور فارسی کے ممتاز عالموں کی قدر شناسی کے پیش نظر اعزازات دینے کی اسکیم سنہ ۱۹۵۸ء میں جاری کی گئی تھی تاکہ ان زبانوں کے اعلیٰ مطالعہ کی حوصلہ افزائی ہو۔ سند کے ساتھ عالموں کو ایک اعزازی پوشاک اور زندگی بھر ۱۵ روپے سالانہ کا عطیہ بھی دیا جاتا ہے۔

ساہتیہ اکیڈمی کا ٹیگور انعام

نئی دہلی میں ساہتیہ اکیڈمی کے صدر پنڈت جواہر لال نہرو کی صدارت میں اکیڈمی کی مجلس عاملہ کا اجلاس ہوا جس میں یہ فیصلہ کیا گیا کہ ٹیگور کے جشن صد سالہ کے سلسلے میں ایک خصوصی "ٹیگور انعام" قائم کیا جائے جو اس مصنف یا عالم کو دیا جائے جس کے مطالعوں، تحقیقوں، تحریروں یا ایڈیٹنگ کے ذریعے ٹیگور کی زندگی اور انکی تصانیف کے بارے میں بہتر مفاہمت کی ترقی میں زیادہ مدد ملی ہو۔ اس انعام میں ساہتیہ اکیڈمی کے ذریعہ تسلیم شدہ سولہ زبانوں میں سے کسی بھی زبان کا کوئی بھی مصنف حصہ لے سکتا ہے۔

انعام دس ہزار روپیہ نقد ہے۔ یہ انعام ۱۱ رنومبر سنہ ۱۹۶۱ء کو نئی دہلی میں انٹرنیشنل لٹریری سیمینار کے موقع پر دیا جائے گا۔ یہ سیمینار ساہتیہ اکیڈمی اور ثقافتی تعلقات سے متعلق انڈین کونسل کے مشترکہ انتظام میں منعقد کیا جا رہا ہے۔

نظیر صدیقی

غزل

گزرتے ہیں جہاں میں آدمی پر ایسے لمحے بھی
جنھیں وہ سہہ نہیں سکتا مگر سہنا ہی پڑتا ہے
وہ باتیں جن کو اپنوں سے بھی کہتے بن نہیں پڑتی
انھیں باتوں کو غیروں سے کبھی کہنا ہی پڑتا ہے
خدا کی یہ زمیں رہنے کے قابل تو نہیں لیکن
جسے جب تک خدا رکھے یہاں رہنا ہی پڑتا ہے
اب ان کا ظرف چاہے ساتھ دیں یا بے رخی برتیں
مصیبت میں مگر اپنوں سے کچھ کہنا ہی پڑتا ہے

عابد اللہ غازی

چار شعر

ہم تنگِ چمن رکھتے ہیں دامن نہ گریباں
سنتے ہیں بہاراں کی کلی کھلنے لگی ہے
کرتے تھے بہت چاک گریباں کی شکایت
غنچوں کی گلشن میں زباں کھلنے لگی ہے
اب تک تو تھے افلاک کی گردش سے پریشاں
اب پاؤں کے نیچے بھی زمیں ہلنے لگی ہے
مے خانہ ہوا بند تو واعظ کے مزے ہیں
مے چوری کی خود آپ کے گھر ملنے لگی ہے

فیضی سنبلپوری

غزل

مے کشو! بزمِ مے کی بات کرو
ذکرِ ساقی تمام رات کرو
بے خودی کا وہ رنگ دکھلاؤ
رات کو دن تو دن کو رات کرو
یہ سکوت و خموشی کیا معنی؟
کچھ تو اپنی پرائی بات کرو
بن کے خورشید کاش آ جاؤ
پُر ضیا دل کی کائنات کرو
گوشِ دیوار ہو کوئی شاید
آنکھوں آنکھوں سے دل کی بات کرو
تشنگی دل کی اور بھڑکا دو
کچھ بیاں قصۂ فرات کرو

راہی بلند شہری

غزل

وہ اختیار کے ہیں نہ دل اختیار کا
کتنا ہے سخت مرحلہ صبر و قرار کا
ساکت ہے شام اور سحر بھی خموش ہے
اس پر بھی حوصلہ ہے ترے انتظار کا
لب ہائے نازنیں پہ تبسم ہے گل فشاں
ترتیب پا رہا ہے فسانہ بہار کا
گلشن میں آج غنچہ و گل ہیں ورق ورق
دامن ہے تار تار عروسِ بہار کا

ناصر شہزاد

غزل

دل کا آنگن بھر گیا اک دھیان کی مہکار سے
چاند نے جس وقت جھانکا رات کی دیوار سے
جھک چلا ہے اک حسیں بستی پہ گلگوں آفتاب
ہو گئے ہیں شہر کے دیوار و در گلنار سے
ہے نظر میری طرف اور رخ مری جانب نہیں
کون مجھ کو دیکھتا ہے اس انوکھے پیار سے
آ و ناصر یہ سنو ہر رات، یہ تنہا گلی
چاندنی کی پتیاں جھڑتی ہیں بامِ یار سے

بالکرشن مہتاب

غزل

نقش سرِ رہگزر رہے ہیں
حالات سے باخبر رہے ہیں
آلام کا رنگ چڑھ رہا ہے
یادوں کے فسوں اتر رہے ہیں
ہر چند کہ تھے غبارِ خاموش
لیکن ترے ہم سفر رہے ہیں
تفسیرِ طلب ہے اب تمنا
اب تک تری بات پر رہے ہیں
سوچیں گے یہ سب جبیں کسی دن
ہم بھی بڑے فتنہ گر رہے ہیں
آئینہ نہ ہو سکے پریشاں
انداز بگڑ سنور رہے ہیں
لہراتی ہے زلف بھیگی بھیگی
انجم سرِ رہ بکھر رہے ہیں

خاور باگوی

غزل

آدمیت کی داستاں ہم ہیں
دردِ انساں کے ترجماں ہم ہیں
گردشیں کیا ہمیں مٹائیں گی
وقت کے نقشِ جاوداں ہم ہیں
تیرہ بختو! کہاں بھٹک رہے ہو؟
[illegible] ہیں روشنی جہاں ہم ہیں
پستیِ خاک سے قریب ہو کر
رشکِ اوجِ آسماں ہم ہیں
مہ جبینو! ہمیں نہ ٹھکراؤ
آرزوئے دلِ جہاں ہم ہیں
حادثے خود دبا گئے غم کو
کتنے بے خوف سخت جاں ہم ہیں!

مفتون کوٹوی

غزل

جن کو تھی ایک روز نئے راستوں کی دھن
وہ آج چل پڑے ہیں زمانے کے ساتھ ساتھ
ہائے یہ رازِ عشق چھپانے کی کوششیں
میں ہنس رہا ہوں اشک بہانے کے ساتھ ساتھ
کھنچ آئی ہیں زمانہ کی رنگینیاں تمام
میری نظر میں ان کے سمانے کے ساتھ ساتھ
بے روح ایک قصۂ منصور و طور کی
عنواں بدل گئے ہیں فسانے کے ساتھ ساتھ

محمد تقی اثر

تین شعر

آپ جس کے حبیب ہوتے ہیں
اُس کے اونچے نصیب ہوتے ہیں
ساری دنیا سے دور رہتا ہوں
جب وہ میرے قریب ہوتے ہیں
جو گزرتے ہیں اُن کی قربت میں
وہ بھی دن کیا عجیب ہوتے ہیں

مراسلات

کچھ "تبرکات غالبؒ" کے سلسلے میں

یکم اگست سنہ ۱۹۶۱ء کے اخبار ہماری زبان میں جناب سراج دھولپوری کا مضمون 'تبرکات غالب' کے عنوان سے شائع ہوا ہے اس میں غالب کی ایک غیر معروف غزل پر سیاح کا مخمس بھی شامل ہے اور اس کے بارے میں لکھا گیا ہے "غزل اور خمسہ ہر دو قدیم رسم خط میں ہیں، مگر، میں بغرض سہولت قارئین حالیہ رسم خط میں منتقل کرتا ہوں" اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس غزل کا موجودہ رسم خط حضرت سراج نے سوچ سمجھ کر اختیار کیا ہے۔ مگر شاید ایک چیز پر موصوف کی نظر نہیں پڑی۔ اس غزل کے قافیے دم، غم، قدم وغیرہ ہیں اور ردیف چند ہے۔ تمام قافیوں کے نیچے زیر لگا کر دمِ چند، غمِ چند، قدمِ چند وغیرہ لکھا گیا ہے۔ لیکن میرے خیال میں کسرۂ اضافت کی جگہ یائے تنکیر لکھنا چاہیے، یعنی دمے چند، غمے چند، قدمے چند وغیرہ۔ امید ہے کہ جناب سراج بھی اس خیال سے اتفاق فرمائیں گے۔

اس مضمون کی دوسری قسط جو ۸ اگست کے 'ہماری زبان' میں شائع ہوئی ہے اس میں سعدی شیرازی کی ایک غزل پر آسیؔ کی 'تضمین' بھی شامل ہے۔ سعدی کی غزل کے مطلع کا دوسرا مصرع اور تیسرے شعر کا پہلا مصرع غلط لکھا گیا ہے۔ ذیل میں غلطیوں کی تصحیح کی جاتی ہے:-

غلط	صحیح
ننگِ بہ عہدی	ننگ بہ عہدی
بندۂ رامی گشتی	بندہ مارا می گشتی

(سید مسعود حسن رضوی ادیب)

کچھ "قادر نامہ" کے بارے میں

"تبرکات غالب" کی دوسری قسط مطبوعہ "ہماری زبان" بابت ۸ اگست ۱۹۶۱ء میں قاضی سراج دھولپوری صاحب نے قادر نامہ کے متعلق لکھا ہے۔

"مرزا کی تصانیف میں منظوم ایک کتاب اور ہے جس کا نہ تو تصانیف کے سلسلے میں کہیں ذکر آیا اور نہ کسی مجموعۂ کلام میں شامل نظر آئی .... مشہور و مستند ہوتے ہوئے بھی شاید کسی کے علم میں نہ ہو گا کہ قادر نامہ کے مصنف مرزا غالب ہیں اور غالباً یہی وجہ ہے کہ یہ معرض اظہار میں نہ آیا۔"

اطلاعاً عرض ہے کہ دیوان غالب نسخۂ عرشی کے تیسرے حصہ میں مثنویات کے تحت قادر نامہ شامل ہے۔ عرشی صاحب نے ص ۱۴۰ پر اس کے بارے میں ایک نوٹ بھی لکھا ہے۔ ان کے مطابق اس کے کلام غالب ہونے میں شبہ نہیں کیونکہ یہ غالب کی زندگی میں ان کے نام سے شائع ہو چکا تھا۔ عرشی صاحب نے میرن صاحب کے مولوی عبدالحق صاحب کے مضمون کا بھی ذکر کیا ہے۔ جس میں انہوں نے میرن صاحب کے حوالے سے لکھا ہے کہ غالب نے یہ کتاب باقر علی خاں اور حسین علی خاں کے لئے لکھی تھی۔ غلام رسول مہر اور مالک رام نے بھی قادر نامہ کا ذکر کیا ہے۔ اول الذکر کو اسے کلام غالب ماننے میں کلام ہے اور موخر الذکر کے نزدیک داخلی شہادتوں کی بنا پر یہ واقعی غالب کی تصنیف ثابت ہوتا ہے۔

قاضی صاحب کی تحریر سے چونکہ خواہ مخواہ غلط فہمی پیدا ہوتی ہے اس لئے تردید ضروری معلوم ہوتی ہے۔

(ابو محمد سحر)

مدعا کے معنی

غالب کے اس شعر میں (کہتے ہو نہ دیں گے ہم دل اگر پڑا پایا۔ دل کہاں کہ گم کیجے ہم نے مدعا پایا) مفہوم یہی ہے کہ دل تو ہمارے پاس ہے نہیں، تمہارے اس کہنے سے ہم مطلب پا گئے کہ تم ہی نے چرایا ہے۔ غالب، مومن، ذوق سب کے یہاں مدعا اسی معنی میں آیا ہے۔

غالب۔ تجاہل پیشگی سے مدعا کیا۔ کہاں تک اے سراپا ناز کیا کیا

مومن۔ مدعا یہ ہے کہ غیرت سے میں سم کھا جاؤں
اس لئے غیر کو وہ اپنی قسم دیتے ہیں

ذوق۔ مدعا آیا ہے بن کر نامہ بر لکھا نصیبوں کا
کریں گے لے کے خط کیا مدعی سے مدعا کیجے

یہ صحیح ہے کہ دہلی میں مدعا مال مسروقہ کے لئے بھی بولا جاتا ہے مگر اول تو یہ عوامی استعمال ہے اور غالب ایسے امور سے پرہیز کرتے تھے۔ دوسرے ان کے یا ان کے معاصرین کے یہاں یہ استعمال نہیں ملتا۔ ہاں یہ دوسری بات ہے کہ اس طرح بے ساختہ طور پر لفظ مدعا میں ایک رعایت بھی پیدا ہو گئی۔

یہاں مدعا بمعنی مال مسروقہ لینے میں یہ قباحت بھی ہے کہ لفظ (پایا) بیکار ہوا جاتا ہے۔ کیونکہ شاعر نے مطلب تو ضرور پا لیا۔ مگر کھویا ہوا دل نہیں پایا۔ وہ خود کہتا ہے، "دل کہاں کہ گم کیجے"۔ دل کا سراغ پانا۔ اور دل کا پانا دو مختلف چیزیں ہیں۔

(ضیاء احمد)

تصحیح

چھتیس گڑھ اردو کانفرنس کی رپورٹ (جو ۸ اگست سنہ ۱۹۶۱ء کے ہماری زبان میں شائع ہوئی تھی) کی تجویز نمبر ۵ میں غلطی سے نارمل اسکول بلاسپور میں بتایا گیا ہے، یہ اسکول برہان پور میں ہے۔

ادارہ

خاتم کے معنی بعض لوگ لفظ خاتم کے معنی ختم اور بند کرنے کے کرتے ہیں۔ حالانکہ خاتم کا لفظ ختم اور بند کرنے کے معنوں میں کبھی استعمال نہیں ہوا۔ اس کے معنی صرف مُہر اور انگوٹھی ہیں۔ لفظ خاتم کے حقیقی معنوں اور استعمال کی چند مثالیں درج ذیل کی جاتی ہیں :-

میر محمد تقی میر دہلوی فرماتے ہیں ؎

ہم جاہ و حشم یاں کا کیا کہیے کہ کیا جانا
خاتم کو سلیماں کے انگشتر پا جانا

(رسالہ تذکیر و تانیث یعنی مشہور بہ مفید الشعراء صفحہ ۹)

میرزا محمد اسداللہ بیگ خاں غالب دہلوی فرماتے ہیں ؎

سلطنت دست بدست آئی ہے
جام جم خاتم جمشید نہیں

(نظم اردو مولفہ مولوی سید قائم رضا نسیم امروہوی صفحہ ۱۳۸)

سید انشاء اللہ خاں انشاء دہلوی فرماتے ہیں ؎

دیکھ اس کی پڑی خاتم یاقوت میں انگلی
ہاروت بنے کی دیدۂ ماروت میں انگلی

(خلاصہ آب حیات آزاد صفحہ ۲۴ تیار کردہ مصور جذبات آغا بیدار بخت خاں بیدار)

شمس العلماء مولانا خواجہ الطاف حسین حالی پانی پتی "مرثیہ مرزا غالب" میں لکھتے ہیں ؎

لو اک مشت خاک کے بدلے
گر ملے خاتم سلیمانی

(ادب اردو مولفہ خان بہادر مولوی ادریس احمد بی اے ایل ٹی حصہ چہارم صفحہ ۲۰۱)

شمس العلماء مولانا شبلی نعمانی اپنی کتاب موازنہ انیس و دبیر صفحہ ۲۹ پر لکھتے ہیں :-

"غالب اور ذوق جو خاتم الشعراء ہیں، ان کے ہاں وہ الفاظ بے تکلف ملتے ہیں جن کو شیخ ناسخ مدتوں سے چھوڑ چکے ہیں۔"

نسیم لکھنوی کہتے ہیں ؎

چلے کی انگوٹھی ڈھیلی پائی • دست آویز اسکے ہاتھ آئی
خاتم کیتی وہ نام کی نشانی • انسان کی دستبرد جانی
ہاتھوں کو ملا، کہا کہ ہیہات • خاتم بھی بدل گیا ہے بدذات

(نوائے ادب صفحہ ۳۱ مولفہ و مرتبہ پروفیسر مخدوم دہلوی)

منشی سرور جہاں آبادی کہتے ہیں ؎

جگمگاتا شب تار میں جگنو ہو کر
کاش رہتا مری خاتم کا نگیں تو ہو کر

(نوائے ادب صفحہ ۲۲ مذکورہ)

ان سب حوالہ جات سے لفظ خاتم کا صحیح استعمال ظاہر ہوتا ہے۔ جو افضلیت اور کمال پر دلالت کرتا ہے۔

(مسعود احمد انیس شاہجہانپوری)

جنوبی منطقے کی کونسل کے فیصلے اور لسانی اقلیت

"ہماری زبان" (مورخہ ۸ر جولائی) کے اداریہ میں جنوبی منطقے کی کونسل کے فیصلوں سے آپ نے جو نتیجے نکالے ہیں، ان میں نمبر ۲ کے تحت آپ تحریر فرماتے ہیں : "حکومت اقلیتوں کے ایسے طلبہ کے لئے جو مادری زبان میں ابتدائی تعلیم حاصل کر رہے ہیں، چھٹے درجے سے علاقائی زبان کو ایک مزید اختیاری زبان کی حیثیت سے پڑھانے کا مناسب انتظام کرے گی ....."

اگر اس قسم کا کوئی فیصلہ کیا گیا ہے تو اس سے دو نتیجے نکلتے ہیں :-

(الف) یہ فیصلہ حکومت ہند (وزارت تعلیم) کے اس ہدایت نامہ کے خلاف ہے جس میں کہا گیا ہے کہ علاقائی زبان ابتدائی مدارس کے تیسرے درجے سے پڑھائی جائے جس کی رو سے ساتویں جماعت تک پہنچتے پہنچتے (جو لازمی تعلیم کی منزل ہونے والی ہے) طلبہ کم از کم پانچ سال کی مدت تک علاقائی زبان سیکھ سکیں گے اور جس کے ذریعے وہ روزمرہ کی زندگی میں اپنے علاقے سے ہم آہنگ ہو سکیں گے۔

(ب) یہ کہ علاقائی زبان لازمی طور پر پڑھائی جانے کے بجائے "مزید اختیاری" زبان کی حیثیت سے پڑھائی جائے، ایک نیا خیال ہے جس پر عمل ہوا تو برے اثرات پیدا ہوں گے۔

میں یہ نہیں سمجھ سکا کہ آپ نے کونسل کے دوسرے فیصلوں کا خیر مقدم کرتے ہوئے ان باتوں کی طرف توجہ کیوں نہ فرمائی؟ گو ان فیصلوں کا تعلق جنوبی منطقے کی ساری لسانی اقلیتوں سے ہے لیکن میری ناچیز رائے میں اردو بولنے والی اقلیت کے لئے یہ بڑی خطرناک بات ہوگی کہ ان کو ایسی پوزیشن میں ڈال دیا جائے جس سے وہ اپنے آپ کو علاقائی زبان کے دھارے سے الگ کر لیں۔ مذکورہ فیصلے میں اس کا پورا امکان موجود ہے۔

(سید شہاب الدین دسنوی)

یہ شعر کس کا ہے؟ ایک بہت اچھا سا شعر میری بیاض میں لکھا ہوا ہے۔ لیکن شاعر کا نام اور تخلص لکھا ہوا نہیں ہے۔ قارئین "ہماری زبان" میں سے کسی کو معلوم ہو تو مطلع فرمائیں۔ شعر یہ ہے ؎

خاک اپنی سمجھ میں کے گئی دست یار میں
شکر خدا کہ ہم بھی ہوئے اب شمار میں

(جہاں بانو نقوی)

[illegible]

انجمن کا خبرنامہ

لسانی کمیٹی اتر پردیش کے سوالنامے سے متعلق

بیگم سلطانہ حیات کا ضروری بیان

لسانی کمیٹی اتر پردیش کا سوالنامہ جاری ہو چکا ہے اسکے جواب آخر اگست تک پہنچ جانا چاہئیں۔ ۳۱ اگست کے بعد جواب پہنچیں گے ان کو قبول نہیں کیا جائے گا۔ اس سوالنامہ کا جواب ہر شخص بھیج سکتا ہے، اور جواب بھیجنے کے لئے کوئی خاص فارم بھی نہیں ہے۔ معمولی کاغذ پر جواب لکھ کر سکریٹری لسانی کمیٹی، دودھان بھون، لکھنؤ کے پتہ پر بھیجنا چاہئے۔

حکومت نے مذکورہ کمیٹی اس بات کا جائزہ لینے کیلئے بنائی ہے کہ حکومت نے اب تک اُردو کو جو حقوق دئے ہیں وہ کہاں تک اس کو عملی شکل میں مل گئے ہیں۔ اور اگر نہیں ملے ہیں تو کمیٹی حکومت سے سفارش کرے کہ اس کو اس سلسلے میں کیا کیا کرنا چاہئے۔

جو لوگ اُردو کے ہمدرد ہیں ان سب کو سوالنامے کے جواب بھیجنا چاہئیں۔ لیکن جواب بھیجنے کے ساتھ ساتھ یہ ضروری ہے کہ وہ جو شکایت پیش کریں اس کا ان کے پاس کاغذ یا گواہ کی شکل میں ثبوت موجود ہو جس کا وہ جواب نامے میں تذکرہ کر دیں۔

سوالنامے کا پہلا حصہ بیسک تعلیم سے متعلق ہے۔ اس میں اگر یہ شکایت کرنا ہے کہ دس اور چالیس کے فارمولے پر عمل نہیں کیا جا رہا ہے تو ضروری ہے کہ یا تو اسکولوں میں اس فارمولے کے مطابق بھی کرانے کی کوشش کی جائے اور کلاس کے دس یا اسکول کے چالیس بچوں کے سرپرستوں کی مشترکہ درخواست مرتب کر کے ہیڈ ماسٹر کو دی جائے اور اگر اس میں کامیابی نہ ہو تو اس درخواست کے حوالے سے شکایت کی جائے۔

ثانوی اسکولوں کے لئے جو سرکاری نصاب ہے اس میں اُردو کو اختیاری مضمون کی حیثیت سے لیا جا سکتا ہے لیکن یہ شکایت عام طور سے سننے میں آرہی ہے کہ میونسپل بورڈ اور ڈسٹرکٹ بورڈ کے اسکولوں میں یہ اعلان کر دیا گیا ہے کہ وہاں داخل ہونے والوں کو اختیاری مضامین میں سے فلاں دو مضامین لینے ہوں گے اور ان دونوں میں اردو کو شامل نہیں کیا گیا ہے۔ اس طرح اردو باوجود نصاب میں شامل ہونے کے اسکولوں میں لی نہیں جا سکتی ہے۔ یاد رہے اگر کسی ثانوی اسکول میں ایسے طالب علموں کی تعداد ایک تہائی سے زیادہ ہے جن کی مادری زبان اُردو ہے تو ان طالب علموں کے لئے ذریعہ تعلیم اُردو ہو سکتا ہے بشرطیکہ اس کی مانگ کی جائے۔ یوپی میں شاید ہی کسی سرکاری اسکول میں ثانوی درجوں میں ذریعہ تعلیم اردو ہو۔ وقت ہے کہ حکومت کو مطلع کر دیا جائے کہ حکومت کا یہ اعلان یوپی کے طول و عرض میں کہیں شرمندۂ عمل نہیں ہوا ہے۔

شکایت کرنے والوں کو اس کا بھی ثبوت پیش کرنا ہوگا۔ یا تو ایسے طالبعلموں کا حوالہ دینا ہوگا جنھوں نے اُردو کی خواہش کی لیکن ان سے کہا گیا کہ اس اسکول میں اُردو نہیں ہے۔ یا اسکول کے اس نوٹس کا حوالہ دینا ہوگا جس میں کام ہی مضمونوں کی تفصیل بتلائی گئی ہے اور ان میں اُردو شامل نہیں ہے۔

بعض بعض ڈسٹرکٹ بورڈ نے باقاعدہ نوٹس کے ذریعہ کہہ دیا ہے کہ اس کے اسکولوں میں صرف فلاں دو یا تین اختیاری مضامین لئے جا سکتے ہیں۔ اور ان میں اردو نہیں ہے ان نوٹسوں کا جواب نامے میں حوالہ ہونا چاہئے۔

بیسک اور ثانوی اسکولوں کی مذکورہ باتیں بہت اہم اور بنیادی ہیں اور اردو دوستوں کو ان کی طرف خاص توجہ دینا چاہئے۔

بعض مقاموں پر ثانوی اسکولوں سے اردو زبردستی اس طرح خارج کر دی گئی ہے کہ ٹیچر سے کہا گیا کہ کوئی طالب علم نہیں ہے اس لئے آپ جائیے اور طالب علموں کی کافی بھاری جماعت سے کہا گیا کہ کوئی ٹیچر نہیں ہے اس لئے اُردو نہیں پڑھائی جا سکتی ہے۔ ایسے اسکولوں کی شکایتیں مع سرپرستوں اور طالبعلموں کے حوالے کے آنا چاہئیں۔

دفتروں اور عدالتوں وغیرہ کے سلسلے میں شکایتیں کرنے سے پہلے ضروری ہے کہ ایک یا دو درخواستیں دی جائیں اگر وہ منظور نہ ہوں تو اس کی شکایت کی جائے۔ اگر تحریری شہادت نہ ہو تو چشم دید گواہوں کا حوالہ دیا جا سکتا ہے۔

ان کے علاوہ سرکاری سوالنامے میں جو سوالات ہیں ان کے جواب وہی حضرات دے سکتے ہیں جن کو ان معاملات کا کوئی تجربہ ہے۔

مناسب ہوگا کہ جو صاحبان جواب بھیجیں وہ ان کی ایک ایک نقل دفتر انجمن ترقی اردو نظر باغ لکھنؤ کو بھی بھیج دیں تاکہ کسی شکایت کے رائیگاں ہونے کا ڈر نہ رہے۔

یہ بات بھی بتلا دینا ضروری ہے کہ اگر ثبوت مہیا کرنے کے لئے وقت تنگ ہو تو یہ بھی ہو سکتا ہے کہ جواب نامہ بھیج دیا جائے اور اس میں یہ لکھ دیا جائے کہ طلب کرنے پر یا شہادت کے موقع پر ثبوت پیش کر دیا جائے گا۔ اور پھر یہ بعد میں فراہم کر لیا جائے۔

نوٹ :۔ جو حضرات اسکولوں اور دفاتر وغیرہ میں اردو کے متعلق شکایتیں حکام بالا تک پہنچانے کے بعد مایوس ہو چکے ہوں وہ اب دوبارہ اپنی شکایتیں لسانی کمیٹی کے سامنے ضرور پیش کریں۔

یہی موقع ہے جبکہ ہم اپنی منظم کوشش سے اُردو کو یوپی میں اس کا جائز مقام دلا سکتے ہیں۔ اگر ہم نے اس طرف توجہ نہ دی تو ڈر ہے کہ لسانی کمیٹی اس نتیجے پر نہ پہنچ جائے کہ اردو والوں کو کوئی شکایت نہیں سب خیریت ہے۔ اور حکومت کے احکامات پر عمل درآمد ہو رہا ہے، جو کہ سراسر حقیقت کے خلاف ہے۔ اس وقت بار ثبوت ہم پر ہے۔ ہمیں یہ بات پایۂ ثبوت تک پہنچانی ہے کہ اردو کو یوپی میں دیدہ و دانستہ ختم کیا جا رہا ہے۔

سلطان پرویز لکھنوی

انجمن ترقی اردو۔ اتر پردیش۔ نظر باغ۔ لکھنؤ

عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد نے جامعہ اُردو کے امتحانات کو منظور کرلیا

رجسٹرار جامعہ عثمانیہ حیدرآباد نے مطلع کیا ہے کہ جامعہ اُردو کے امتحانات ادیب ماہر و ادیب کامل کو عثمانیہ یونیورسٹی کے لئے منظور کرلیا گیا ہے۔ ادیب ماہر کی سند کو انٹرنس امتحان کے مساوی تصور کرلیا گیا ہے ادیب ماہر پاس کرنے کے بعد طالب علم ڈپلوما ان اورینٹل لنگویجز (اردو) میں داخلہ لینے کا مجاز ہوگا اور ادیب کامل کی سند کو ڈی۔ او۔ ایل اُردو کے مساوی تصور کیا گیا ہے۔ ادیب کامل پاس کرنے کے بعد طالب علم بیچلر آف اورینٹل لنگویجز (اُردو) میں داخلہ لینے کا مجاز ہوگا۔

(رجسٹرار۔ جامعہ اُردو۔ علی گڑھ)

گورنر گجرات ایوان اُردو میں

حیدرآباد۔ ۳ر اگست کو ۱۱½ بجے نواب مہدی نواز جنگ گورنر گجرات نے ایوان اردو اور ابوالکلام آزاد اورینٹل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کا معائنہ کیا۔ اس موقع پر ڈاکٹر مہندر راج سکسینہ شریک معتمد ادارہ و انسٹی ٹیوٹ نے نواب صاحب کا خیر مقدم کیا اور ان کی خدمت میں انسٹی ٹیوٹ کی تازہ مطبوعات کتاب التذکرہ (مرتبہ پروفیسر ہمایوں کبیر) اور ماسٹر رام چند (مولفہ ڈاکٹر سیدہ جعفر) پیش کیں۔ (د۔خ)

دفتر انجمن ترقی اُردو، کلکتہ میں ڈاکٹر اختر اورینوی

ملک کے مشہور افسانہ نگار، نقاد اور شاعر ڈاکٹر اختر اورینوی صدر شعبۂ اُردو، پٹنہ یونیورسٹی کے اعزاز میں ایک جلسہ استقبالیہ انجمن ترقی اُردو، کلکتہ کی طرف سے ۹ر اگست ۹۱ء کی شام کو دفتر انجمن میں منعقد ہوا جس میں مقامی شاعروں، ادیبوں اور صحافیوں کے علاوہ دیگر حضرات نے شرکت فرمائی۔ عصرانہ کے بعد جناب سید امیر رضا کاظمی کی صدارت میں ادبی کارروائی کا آغاز ہوا۔ سب سے پہلے کنوینر نے ڈاکٹر موصوف سے حاضرین کا تعارف کرایا۔ اس کے بعد ڈاکٹر صاحب نے "اردو شاعری" پر ایک مختصر اور پُرمغز تقریر فرمائی۔ آپ نے فرمایا کہ ہمارے ہاں شاعروں کو داد دینے کا جو طریقہ ہے اس میں تبدیلی کی ضرورت ہے۔ داد خاندانی حصّوں کی طرح بانٹی جاتی ہے، جو ایک ذہین شاعر کے لئے آزمائش سے کم نہیں۔ ہم صرف الفاظ اور تراکیب کی داد دیتے ہیں حالانکہ الفاظ کچھ بھی نہیں۔ اس میں تبدیلی کے لئے صرف شاعروں کی نہیں، بلکہ سماج کی بھی تربیت کی ضرورت ہے۔ ہماری شاعری میں غزل کا ایک اہم مقام ہے لیکن اس سے بھی انکار ممکن نہیں کہ اسی نے ہمارے شاعروں میں پراگندگیٔ فکر اور "ریزہ کاری" کو فروغ دیا ہے۔ آج کا دور تعمیرِ نظم کا دور ہے، دنیا ہماری عظمت کی قائل اسی وقت ہوگی جب ہم عظیم تخلیقات پیش کریں گے، اور دنیا کو نئی خوبصورتیاں عطا کریں گے۔ ہمارے موجودہ اردو ادب میں بھی ایک بھاگرہ شکل کی ضرورت ہے، ہمیں غزلوں کو نئے سانچے میں ڈھالنا ہوگا اور نظموں میں نئے مسائل کو حسن و رنگینی کے ساتھ پیش کرنا ہوگا۔ اس کے لئے ہمارا ملکی اور غیر ملکی ادب سے آشنا ہونا نہایت ضروری ہے۔ ڈاکٹر صاحب کی یہ تقریر حاضرین نے نہایت خاموشی اور دلچسپی سے سُنی۔ اس کے بعد مقامی شاعروں میں پروفیسر جمیلہ شاہدی، ادلیس احمد دوراں اور علقمہ شبلی نے اپنی غزلیں سُنائیں اور پھر اختر اورینوی نے اپنی ایک نہایت ہی مرصّع غزل سے محظوظ فرمایا۔ آخر میں جناب صدر نے ایک غزل سُنائی اور معزز مہمان اور حاضرین کا شکریہ ادا کیا۔ (علقمہ شبلی کنوینر ادبی کمیٹی)

دھولیہ میں انجمن ترقی اُردو کا قیام

دھولیہ۔ ۱۳ر اگست حضرت مولانا آسی کے مکان پر "بزمِ اتحاد" کی طرف سے حضرت نظر مالیگانوی کی صدارت میں ایک مشاعرہ ہوا جس میں انجمن کے قیام کے مسئلے پر بھی غور کیا گیا۔ چنانچہ حضرت کلیم کریمی، رشید صہبائی، عابد ابن اثر، عمر انصاری، مختار احسن، اثر انصاری، ایم۔ احسن، عاجز پرتاب گڈھی، نورانی نور، اور شہاب حنیفی، پر مشتمل عارضی کمیٹی کی تشکیل ہوئی جو تین مہینے تک ممبرشپ کا کام کرے گی اور ریاستی انجمن سے ملحق ہو کر اردو زبان کی تعمیر و ترقی میں اپنا حق ادا کرے گی۔ امید ہے کہ دھولیہ کے اردو دوست حضرات دلی تعاون سے انجمن کو نوازیں گے۔

(شعبان انصاری سکریٹری)

انجمن ترقی اُردو (ہند) ناگپور شاخ کی تشکیل

۵ر اگست ۱۹۹۱ء کو مدرسہ اسلامیہ مومن پورہ میں انجمن ترقی اُردو (ہند) ناگپور برانچ کی تشکیل کے لئے محبان اردو کا ایک مشاورتی جلسہ ہوا جس میں انجمن کے قیام کے لئے ایک ایڈہاک کمیٹی کا انتخاب کیا گیا جو مندرجہ ذیل حضرات پر مشتمل ہے۔

صدر: جناب حمید ناگپوری صاحب۔
سکریٹری: جناب شاہد کبیر صاحب۔
خازن: جناب ناظم انصاری صاحب۔

اراکین: جناب شریف احمد شریف صاحب، جناب عبدالخالق صاحب، جناب معین الدین صاحب اور جناب ایس۔ کے ظفر صاحب۔

انجمن ترقی اُردو (ہند) شاخ ناگپور کی آئندہ نشست ۳ر ستمبر ۹۱ء کو ہوگی جس میں عام ممبران کے ذریعہ مستقل کمیٹی کا انتخاب کیا جائے گا۔ تب تک ایڈہاک کمیٹی ممبر سازی کا کام کرے گی۔ (شاہد کبیر سکریٹری)

بابائے اُردو کے انتقال پر

شعبۂ اُردو مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کا تعزیتی جلسہ

۱۷ر اگست ۱۹۶۱ کو بابائے اُردو مولوی عبدالحق کے انتقال پر شعبۂ اُردو مسلم یونیورسٹی کا ایک تعزیتی جلسہ فلاسفی لیکچر تھیٹر میں زیر صدارت پروفیسر آل احمد سرور ہوا۔

بابائے اردو کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے سرور صاحب نے کہا کہ "بابائے اُردو نے جس طرح اپنی زبان اور ادب سے عشق کیا اور اپنے مقصد کے حصول کے لئے جدوجہد کی اس کی مثال مشکل سے ملے گی۔ بابائے اُردو علی گڑھ کے اولڈ بوائے اور اپنے زمانے کے بہترین طالب علم تھے۔ تعلیمات سے سبکدوش ہونے کے بعد وہ عثمانیہ یونیورسٹی میں شعبۂ اُردو کے پروفیسر ہوئے۔ اور وہاں سے فراغت پانے کے بعد انجمن ترقی اُردو کے کاموں میں لگ گئے جو آخر دم تک انجام دیتے رہے۔ بابائے اُردو کا نام اور ان کے کارناموں سے ہندوستان اور پاکستان ہی کے لوگ نہیں بلکہ دنیا کے وہ تمام لوگ واقف ہیں جو اُردو پڑھتے ہیں اور اس سے دلچسپی رکھتے ہیں۔ وہ بیک وقت ایک بڑے ادیب، محقق، نثر نگار اور مجاہد تھے۔ اُنھوں نے اپنی ساری زندگی اُردو زبان کے حقوق کی حفاظت کرنے اور اسے فروغ دینے کے لئے وقف کر دی اور آخر دم تک اس عظیم مقصد کے لئے جدوجہد کرتے رہے۔ سرسید کے بعد اُردو زبان و ادب کی سب سے زیادہ خدمت اگر کسی ایک شخص نے کی ہے تو وہ عبدالحق ہیں۔ عبدالحق ان عظیم اور برگزیدہ ہستیوں میں سے ہیں جو مر کے بھی نہیں مرتیں۔ بعد ازاں سرور صاحب کی تقریر کے بعد مندرجہ ذیل تعزیتی تجویز پاس کی گئی اور اعلان کیا گیا کہ آج شعبۂ اُردو میں کلاسیں نہیں ہوں گی۔

"شعبۂ اُردو مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے اساتذہ اور طلبہ کا یہ جلسہ بابائے اُردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق کے انتقال پر اپنے دلی رنج و غم کا اظہار کرتا ہے۔ مولوی عبدالحق اُردو زبان کے سچے عاشق، اس کے پرستار اور بہت بڑے محسن تھے۔

انھوں نے اپنی پوری زندگی اُردو کے تحفظ، اس کی بقا اور اس کے علمی و ادبی سرمائے کی تعمیر و ترقی کے لئے وقف کر دی۔ ان کے ہاتھوں انجمن ترقی اُردو ایک معمولی ادارے کے بجائے ایک اہم تحریک بنی۔ مولوی صاحب نے اردو کی قدیم اور نایاب کتابوں اور کلاسیکی سرمائے کو نہ صرف یہ کہ دست برد زمانہ سے محفوظ کرنے کی کوشش کی بلکہ ان کے متن کی تصحیح اور ان کے بارے میں مناسب مقدمے اور حواشی لکھ کر اردو میں ادبی تحقیق کی بنیاد ڈالی۔ سرسید کے بعد مولوی عبدالحق ہی وہ اہم شخص ہیں جن کی زندگی کا مقصد اردو زبان و ادب کے سرمائے کو وسیع کرنا اور اسے دنیا کی ترقی یافتہ زبانوں کے قریب لانا تھا۔ وہ نہایت مخلص، جفاکش، پرجوش اور اپنی دھن کے پکے انسان تھے اور اردو کی خدمت کے لئے انھوں نے جو قربانیاں کیں انھیں کبھی فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ اُردو زبان میں ادیب، شاعر، مصنف اور محقق بہت سے پیدا ہوں گے لیکن اُردو کا اتنا بڑا شیدائی اور جاں نثار شاید ہی پیدا ہو۔

یہ جلسہ مرحوم کے حق میں دعائے مغفرت کرتا ہے اور انکی وفات کو اُردو زبان کے حق میں ایک عظیم سانحہ سمجھتا ہے۔"

(حکیم محبوب عالم سکریٹری)

بابائے اُردو ڈاکٹر عبدالحق کو بھوپال میں خراج عقیدت

بھوپال ۲۰ر اگست :- قومیت، وطنیت، رنگ و نسل اور جغرافیائی حدیں کسی بھی ادیب، فنکار یا ادب کے درمیان حائل نہیں ہوتیں۔ موجودہ دور میں اُردو صرف پاکستان یا ہندوستان ہی کی زبان نہیں بلکہ وہ دنیا کے کئی ملکوں میں بولی، سمجھی، لکھی اور پڑھی جاتی ہے۔ اس کا دائرہ بڑھتا جا رہا ہے۔ ایشیائی ملکوں کے علاوہ روس، افریقہ، امریکہ اور یورپی ممالک میں بھی اس زبان سے محبت کرنے والے موجود ہیں۔ ان حالات میں اس زبان کے ایک عظیم خدمتگار کی موت یقیناً دنیائے اُردو کے لئے ایک ناقابل تلافی نقصان ہے۔

ڈاکٹر مولوی عبدالحق جن کو ان کی اُردو زبان و ادب کی بیش بہا خدمات کے سلسلے میں بابائے اُردو کہا جاتا ہے اُن کی جُدائی ایک زبردست حادثہ ہے۔ بھوپال کے اُردو زبان و ادب سے دلچسپی رکھنے والوں اور اس زبان کے شاعروں، ادیبوں اور صحافیوں کا ایک تعزیتی جلسہ بھوپال کے قدیم صحافی اور بزرگ شاعر جناب محمد یوسف قیصر صاحب کی صدارت میں ہوا جس میں ایک تعزیتی قرارداد منظور کی گئی جس میں کہا گیا ہے کہ یہ جلسہ بابائے اُردو مولوی عبدالحق صاحب کے سانحۂ ارتحال پر اپنے دلی رنج و غم کا اظہار کرتا ہے اور ان کی موت کو دنیائے اُردو کے لئے عظیم نقصان متصور کرتا ہے۔ مرحوم نے جس خلوص اور جانفشانی سے اُردو ادب کی ترقی، اور ترویج میں نمایاں خدمات سرانجام دی ہیں انھیں کبھی فراموش نہیں کیا جا سکتا۔

یہ جلسہ مرحوم کے پس ماندگان سے اپنی دلی ہمدردی کا اظہار کرتا ہے، اور خدا سے دعا کرتا ہے کہ وہ ڈاکٹر صاحب کو اپنے جوار رحمت میں جگہ دے۔

جلسے میں دو منٹ کھڑے ہو کر بابائے اُردو کو خراج عقیدت پیش کیا گیا۔

تبصرے

ضیاء احمد بدایونی

رس از جناب جگر بریلوی۔

ملنے کا پتہ۔ دانش محل بک سیلرز۔ امین الدولہ پارک لکھنؤ قیمت ۲ روپے۔

جناب شیام موہن لال جگر بریلوی اُردو کے ایک کہنہ مشق شاعر مشہور ادیب اور مانے ہوئے محقق ہیں۔ جو ستائش کی تمنا اور صلے کی پروا سے بے نیاز ہو کر چالیس پچاس سال سے اردو کی خدمت میں لگے ہوئے ہیں۔ انکی متعدد تصانیف جنمیں سے چند زیور طبع سے آراستہ ہو چکی ہیں انکی قدرت سخن۔ واقفیت فن اور تحقیق زبان کی شاہد عدل ہیں خصوصاً پیام ساوتری اور یادِ رفتگاں ملک کے ادبی حلقوں میں کافی مقبولیت حاصل کر چکی ہیں۔ زیر نظر کتاب "رس" حضرت جگر کی رباعیات کا مجموعہ ہے۔ اگرچہ غزل کے بارے میں ان کا ایک خاص نظریہ ہے اور وہ غزل میں ایک مقام رکھتے ہیں لیکن ان کی رباعیات سے بھی سرسری طور پر گزر جانا ممکن نہیں، رباعی ایک ایسی صنف شعر ہے جس کی ٹکنیک پر پوری قدرت کامل ریاض چاہتی ہے یہی وجہ ہے کہ اردو میں چوٹی کے رباعی نگاروں کی تعداد زیادہ نہیں ہے۔ تاہم یہ واقعہ ہے کہ جگر صاحب کی رباعیاں عموماً مواد و ہیئت یعنی فکر و فن کے لحاظ سے لائق تحسین ہیں ان کے موضوعات یہ ہیں، غم والم، واضح رہے کہ وہ زندگی کو غم والم سے لبریز مانتے ہیں اور چونکہ ان کو زندگی میں ناخوشگوار حالات سے سابقہ رہا ہے اس لئے ان کے یہ تاثرات حقیقی ہیں، عرفان نفس۔ روحانیات کا احترام۔ اخلاقیات کا درس۔ بے ثباتی عالم۔ جبریت۔ صبر و قناعت۔ کہیں کہیں شباب زندگی اور رندی و مستی کی جھلک بھی نظر آتی ہے۔ مگر بیشتر غم والم ہی پر تان ٹوٹتی ہے۔ مجموعے میں چند ایسی رباعیات بھی ہیں جو کسی فوری واقعے سے متاثر ہو کر لکھے ہیں۔ مگر حسن شعر سے معرا ہیں۔ محض سیدھے سادے طریقے سے کوئی بات نظم کر دی گئی ہے۔ مثلاً

اکثر میں پڑھے لکھوں میں ایسے احباب • بیٹے نہیں جو کسی کے ماں باپ کا جواب

ہر چند وہ ذی وقار و ذی جاہ سہی • تہذیب کے یہ روش منافی ہے جناب

بعض رباعیات پر ابن یمین کے قطعات کی صدائے بازگشت سنائی دیتی ہے

وہ خان جوین ہوں اور ٹھنڈا پانی • آزادیاں حائل ہوں نہیں سن مانی

محبوب ہو دلنواز اور بادہ سلسبیل • یہ زینت ہے معراج حیات فانی

مگر اس سے یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ یہ خیالات ان کے یہاں روایتی ہیں۔ اسکے برخلاف ان کی شاعری ان کی زندگی کا آئینہ ہے اور وہ وہی کہتے ہیں جو محسوس کرتے ہیں۔ ان کے مقدمہ نگار جناب ڈاکٹر ادیب بریلوی نے سچ کہا ہے کہ دبستان دہلی و لکھنؤ کے علاوہ دبستان روہیل کھنڈ کا بھی شعر و ادب میں نمایاں رول رہا ہے اور یہ حقیقت ہے کہ اس دبستان میں جگر بریلوی کی ادبی خدمات کا اعتراف نہ کرنا بڑا ظلم ہوگا۔

تعلیمات اسلام

(جلد دوم) مرتبہ مولانا عبد السلام قدوائی ندوی۔

ناشر جامعہ طلبیہ اسلامیہ نئی دہلی۔ ملنے کا پتہ۔ جامعہ نگر نئی دہلی ۲۵ اُردو بازار دہلی میں۔ صفحات ۲۰۸۔ قیمت ۲ روپے ۲۵ نئے پیسے۔

تعلیمات اسلام کی دوسری جلد ہے جو عبادات و معاملات سے متعلق ہے اس سے پیشتر پہلی جلد جو متعلق بہ عقائد ہے ہماری زبان میں تبصرہ ہو چکا ہے موجودہ جلد بھی مشاہیر اہل قلم کے مالا مال گراں قدر مقالات پر مشتمل ہے۔ لکھنے والوں میں ہند اور بیرون ہند کے علماء ہیں جنھوں نے ارکان اسلام کے علاوہ اسلامی معاشرہ۔ تعدد ازدواج۔ طلاق و خلع معاشیات۔ سرمایہ دار مزدور۔ جہاد۔ جزیہ۔ غلامی وغیرہ کے موضوعات پر روشنی ڈالی ہے۔ ہر مقالے پر اظہار خیال کرنا۔ یا ہر رائے سے اتفاق کرنا تو مشکل ہے۔ مگر یہ کہنا ہرگز مبالغہ نہیں کہ کتاب زیر نظر قیمتی اور مفید معلومات کا مجموعہ ہے جس سے دارالعلوم اور یونیورسٹیوں کے طلبہ بے نیاز نہیں ہو سکتے۔ جو اصحاب اسلامی مسائل کو جدید نقطۂ نظر سے دیکھنا اور سمجھنا چاہتے ہیں انکے لئے بھی کتاب مذکور کی افادیت اور اہمیت میں کوئی شبہ نہیں۔

غلام رسول، حیدرآباد

اُردو کے نئے اعراب اور اُن کی اہمیت

اس میں شک نہیں کہ اُردو زبان ہندوستان اور پاکستان کی سرحدوں کو عبور کرکے روس اور امریکہ کے ملکوں تک جا پہنچی ہے۔ ترویج و اشاعت کے لحاظ سے دنیا میں اس کا تیسرا درجہ ہے۔ باوصف اس کے اُردو رسم خط خود غیر اعرابی ہونے کے سبب بعض اوقات لفظوں کا صحیح تلفظ ادا کرنے میں قاصر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ارباب اُردو کے لئے زبان کی اصلاح ایک اہم مسئلہ بن گیا چنانچہ سابق میں انجمن ترقی اُردو (ہند) نے اُردو رسم خط کی اصلاح کے لئے قابل اور ماہرین افراد کی کمیٹی بٹھائی اور اپنے ترجمان کے ذریعے یعنی رسالۂ اُردو میں بھی اصلاحی مضامین شائع کرائے۔ لیکن رسم خط کی اصلاح کا مسئلہ جذبات سے آگے بڑھ نہ سکا۔ اس کی تکمیل ضروری تھی۔ وقتاً فوقتاً اُردو کانفرنسوں کے اجلاسوں میں بھی اُردو رسم خط کا مسئلہ زیر بحث رہا، وہاں بھی خاطر خواہ کامیابی نہیں ہوئی۔ اس طرح ایک عرصے تک یہ مسئلہ نامکمل جز التوا میں پڑا رہا۔ زمانۂ ماضی قریب میں اُردو کی درسیہ کتابوں کی تصنیف و تالیف کا مجھے موقع ملا۔ اس وقت بعض لکھاوٹ کی دقتیں پیش آئیں تو مجھے اُردو رسم خط کی اصلاح کی فکر دامن گیر ہوئی، پس میں نے اس کے لئے ہمہ تن کد و کاوش شروع کر دی۔ ایک عرصے کے غور و خوض کے بعد میں اپنی کوشش میں کامیاب ہوا۔ میں نے اپنی سوجھ بوجھ سے اردو کے چار نئے اعراب (۱) واوِ لین (۲) یائے لین (۳) رائے ممدودہ، اور (۴) نیمہ دریافت و ایجاد کئے، جو اُردو رسم خط کے اہم ستون ہیں ان کے وجود میں آنے کی وجہ سے اُردو کا رسم خط نے ہندی کو بھی مات کر دیا۔ ہندی والوں کا یہ دیرینہ اعتراض کہ اُردو زبان میں سنسکرت کے لفظوں کو صحیح طور پر لکھا ہی نہیں جا سکتا ہے۔ اب کوئی حق و صداقت نہیں رکھتا ہے، وہ ایک مہمل سی بات ہو کر رہ گیا ہے۔

اب ارباب اُردو اور اُردو دوستوں کا کام یہ ہے کہ وہ ان نئے اعرابوں کی پوری پابندی کریں اور ان کو رائج کرنے میں تندہی سے کام لیں۔ اور اُردو نحویوں کو چاہئے کہ وہ ان اعرابوں کو اُردو قواعد میں داخل کریں اور نیز اُردو مصنفین درسیہ (ریڈروں) کے ذریعے اُردو دنیا میں ان کی اشاعت کریں۔ ایک عرصے کے بعد اُردو والے ان اعرابوں سے واقف ہو جائیں گے اور اُردو زبان کا وقار بڑھے گا اور ہمسایہ زبانوں میں اس کا بول بالا ہوگا۔ اب ان نئے اعرابوں کی اہمیت کو نیچے واضح کیا جاتا ہے:-

(۱) واوِ لین (ۏ)۔ اُردو والے اس اعراب کو سابق میں واو ماقبل مفتوح پکارا کرتے تھے اور آج تک یہی کہلایا جاتا ہے۔ (۲) یائے لین (ێ) یہ اعراب بھی اُردو میں یا ماقبل مفتوح کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے اور ابھی اسی نام سے مشہور ہے۔

میری تحقیق میں یہ دونوں اعراب اُردو دنیا میں غلط طور پر مشہور ہو گئے تھے حالانکہ علم نحو کی رو سے انھیں علی الترتیب واوِ لین اور یائے لین کے ناموں سے پکارا جانا چاہئے تھا۔ آج تک اُردو والے ان سے بے خبر ہیں۔ چنانچہ اردو کی موجودہ قواعد میں ان کا کہیں نام و نشان تک پایا نہیں جاتا ہے۔ ان دو نئے اعرابوں کی بدولت ہماری زبان میں ہندی نے (ऐ) اور اوز (औ) کا بدل خودبخود پیدا ہوگیا۔ اس طرح اُردو اعراب میں ان اعرابوں کا راستہ کھل گیا اور اُردو رسم خط میں وسعت پیدا ہوگئی۔ (۳) رائے ممدودہ (ۯ)۔ ہماری زبان میں ہندی ری (ऋ) کا کوئی بدل موجود نہیں تھا۔ یہ بات مشہور ہو چلی تھی کہ سنسکرت ری کو اُردو میں لکھنا محال ہے۔ چنانچہ ہندی والے طعنہ دیتے تھے کہ کرشن (कृष्ण) کرپا (कृपा) اور امرت (अमृत) جیسے لفظوں کو اُردو میں لکھا ہی نہیں جا سکتا ہے۔ میں نے اپنی غور و فکر سے اس کے لئے نئے اعراب کا پتہ لگا لیا اور اُردو کی مناسبت سے اس کی علامت (ر) دریافت کی اور اعراب کا نام رائے ممدودہ تجویز کیا۔ یہ اُردو کے لئے بالکل نیا اعراب ہے۔ اس کے ذریعہ بیشتر اُردو میں سنسکرت الفاظ کا لکھنا محال تھا اب ان کا لکھنا سہل تر ہو گیا۔ (۴) نیمہ (ں)۔ یہ اعراب اُردو والوں کے لئے بالکل نیا ہے۔ اب تک اس کو "نصف جزم" کے نام سے پکارا جاتا رہا ہے حالانکہ اس طرح کہنا غلط ہے، کیونکہ اُردو میں جزم ایک ہی ہوتا ہے اور وہ کتابت میں یوں (ْ) لکھا جاتا ہے اور ٹائپ میں (ٔ) کی طرح چھاپا جاتا ہے۔ یہ اعراب بھی مثل واوِ لین اور یائے لین کے اُردو دنیا میں غلط طور پر مشہور ہو گیا ہے۔ اُردو جیسے بے اعراب رسم خط کے لئے، اعراب بڑی اہمیت رکھتا ہے، لیکن اُردو والوں کی اس کی طرف گہری نظر ہی نہیں پڑی۔ اس کے وجود سے ہماری زبان میں اجنبی لفظوں کی لکھاوٹ کے لئے ایک نیا باب کھل جاتا ہے۔ اس کی شکل صورت پر غور کرنے سے پتہ چلا کہ اسی قبیل کی علامت سنسکرت اور ہندی میں بھی پائی جاتی ہے جو چندر بندو کہلاتی ہے اور اس کی علامت یوں (ँ) ہوتی ہے۔ اُردو والوں نے اس کے پیش نظر اپنی جدت طرازی سے چاند نشان کو گھٹا کر (ں) بنا دیا۔ اب تک یہ برابر اُردو میں نون غنہ کی علامت کے طور پر رائج ہے اور تیس چالیس سال سے انجمن ترقی اُردو ہند اپنے درسیہ میں اس سے یائے مجہول (ے) کا بھی کام لے رہی ہے۔ یہ سب کچھ افادیت کے باوجود اس کا کوئی صحیح نام نہیں رکھا گیا۔ میں نے سوچ بچار کے بعد اُردو کی مناسبت سے اس کا نام نیمہ تجویز کیا ہے کیونکہ یہ اس حرف کی آواز کی جس پر یہ علامت لکھی جاتی ہے آدھی آواز کی نمائندگی کرتا ہے۔ اس لحاظ سے اس کا نام نیمہ ہونا چاہئے چنانچہ سابقہ حرکات یعنی فتحہ کسرہ اور ضمہ کے طور پر اس کا نام نیمہ رکھنا پسند کیا گیا۔ یہ بڑا کارآمد اعراب ہے۔ اُردو دنیا میں اس کو روشناس کرنا چاہئے، اردو قواعد میں داخل کریں اور درسیہ کی کتابت میں چالو کرنا چاہئے۔ اس لئے اعراب کے وجود اور چلن سے اجنبی زبانوں کے الفاظ کا صحیح پڑھنا لکھنا بہت ہی آسان ہو جاتا ہے، اس طرح اُردو رسم خط وسیع اور جامع ہو جاتا ہے۔

اب اُردو اور اجنبی لفظوں کی مثالوں کے ذریعے مذکورہ بالا اعرابوں کا عملی ثبوت پیش کیا جاتا ہے:-

(۱) واوِ لین۔ مثلاً: وقت، پھوڑا، دوڑنا، کوئل۔
(۲) یائے لین۔ مثلاً: میلا، تھیلا، عیب، قیمتی۔
(۳) رائے ممدودہ۔ مثلاً: مرگ، گرہ، ہردے، پرتو (رائے ممدودہ کا ماقبل حرف ہمیشہ مکسور ہوتا ہے اس لئے زیر دینے کی ضرورت نہیں)
(۴) نیمہ۔ مثلاً (اُردو) پیاز، بیوس، دھیان، سیوتی۔
مثلاً (ہندی) ہوا، شور، شیام، شیوراج۔
مثلاً (سنسکرت) تیاگ، سواگت، ویاکل، وِدیوشنا۔
مثلاً (انگریزی) ٹائپ، فیکٹ، بیل، ٹیگ، شکول، برج۔

پبلشر نذیر حسن پرنٹر ضمیرالدین قریشی نے مسلم ایجوکیشنل پریس علی گڑھ میں چھپوا کر مرکزی انجمن سے شائع کیا